یونہی آنکھیں بند کیا لیٹا تھا۔ سیما نے اندر آ کر کہا۔ ''زمان صاحب وہ کتاب آپ کے پاس ہے؟''

زمان نے آنکھیں کھول کر جواب دیا۔ ''اس میز پر پڑی ہے۔'' اور پھر کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ میں اپنی چارپائی سے اٹھ کر ان کے ساتھ کتاب تلاش کرنے لگا لیکن وہ نہ ملی۔ سیما نے پھر کہا۔ ''مسٹر زمان، کتاب یہاں تو نہیں۔''

زمان نے اسی طرح لیٹے لیٹے جواب دیا۔ ''یہیں کہیں ہوگی۔ پرسوں تو اسی میز پر پڑی تھی۔''

سیما اور ساوتری نے اس بدتمیزی پر احتجاجاً تلاش بند کر دی اور منہ پھلائے چلی گئیں۔

میں نے کہا۔ ''یار، عجیب احمق ہو۔۔۔۔۔''

اس نے کہا۔ ''ہوں۔'' اور پھر سو گیا۔

ایک مرتبہ جب کالج میں لدرامے کی ریہرسل ہو رہی تھی تو زمان بھی وہاں پہنچ گیا۔ سیما پانی کے جگ کے پاس کھڑی تھی۔ سلیم اپنا مکالمہ بول پانی سے حلق تر کرنے آیا تو سیما نے گلاس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اُوں ہوں! باہر نل پر جا کر پانی پیجئے۔ پتہ نہیں کیسے کیسے لوگ اس ایک ہی گلاس سے پانی پیتے گئے ہیں۔'' تو سلیم نے اس کی ہمدردی سے بہت مرعوب ہوا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سیما کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل گیا۔ زمان نے کہا۔ ''مجھے بھی پیاس لگی ہے اور سیما نے پھر گلاس پر ہاتھ رکھ کر یہی کہا تو زمان نے گلاس اس کے ہاتھ سے کھینچ کر جگ سے پانی انڈیلا اور غٹ غٹ پی گیا۔ سیما نے کہا۔ ''ضدّی کہیں کا۔''

زمان نے کہا۔ ''وہمی کہیں کی!'' اور ایک مصنوعی ڈکار لے کر ہال سے باہر آ گیا۔ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں باکسنگ کا مقابلہ ہوا۔ ہمارے کالج کے علاوہ دوسرے کالجوں کے طلبا بھی یہ مقابلہ دیکھنے آئے۔ زمان کا مقابلہ پنجاب رجمنٹ کے ایک کپتان سے ہوا اور زمان ہار گیا۔ رنگ سے باہر نکل کر اس نے سیما اور سلیم کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا۔ ان کے قریب جا کر زمان نے سیما سے پوچھا۔ ''مقابلہ پسند آیا؟''

''بہت!'' سیما نے مسکرا کر کہا۔ ''اچھا ہی ہوا۔ آپ کا مان بھی ٹوٹا۔ اپنے آپ کو پتہ نہیں کیا جولائی سمجھے ہوئے تھے۔''

زمان نے شرارت سے مسکرا کر کہا۔ ''مان ٹوٹا! میں کوئی ہارا ہوں؟'' پھر اس نے اپنے خون آلود چہرے پر پڑے ہوئے نیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمغے کامیابی کے بغیر تو نہیں ملتے نا، سلیم صاحب۔'' سلیم کو یہ بات بہت ناگوار گذری اور وہ سیما کو لے کر جلدی جلدی سیڑھیاں اتر گیا۔

سردیوں کی ایک تیرہ و تاریک رات کو بارہ بجے کے قریب وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے سر اور بازو پر پٹیاں بندھی تھیں اور ان سے خون رس رہا تھا۔ بتّی جلنے سے میں جاگ اٹھا اور اسے اس حالات میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے رضائی پرے پھینک کر پوچھا۔

''کچھ نہیں یار۔'' اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں دبائی اور ماچس میز پر پہلو کے بل کھڑی کر کے دائیں ہاتھ سے اس پر دیا سلائی رگڑنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''میں جلائے دیتا ہوں۔'' تو اس نے جھلا کر کہا۔ ''آخر کیوں؟ میں اپنی سگریٹ بھی خود نہیں سلگا سکتا؟''

میں نے پھر پوچھا۔ ''تم زخمی کیسے ہو گئے؟'' تو اس نے ہنس کر کہا۔ ''جیسے ہوا کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ میں حملے کے جواب کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ مجھ پر ایک دم پل پڑا اور چاقو سے کھچاک کھچاک کئی زخم لگا دیئے۔۔۔۔۔۔۔ پھر میں پٹی کروانے ہسپتال چلا گیا۔ اسی لیتو مجھے دیر گئی اور یار آج دیر سے آنے پر جواب طلبی بھی ہو گی اور جرمانہ بھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''مگر وہ تھا کون؟''

''مجھے کیا خبر۔'' اس نے بستر میں لیٹتے ہوئے کہا۔ ''ایسی تاریک رات میں کہیں شکل پہچانی جاتی ہے۔''

''وہ کچھ بولا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بولا تھا۔''

''کیا کہتا تھا؟''

''میں نہیں بتاتا۔''

میں نے گالی دے کر کہا۔ ''تو جا جہنم میں۔ تجھ سے پوچھتا ہی کون ہے۔''

اس پر وہ ہنسنے لگا اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دیر تک ہنستا رہا۔ بتی بجھا کر اور اپنے بستر میں منہ لپیٹ کر میں جی ہی جی میں اسے گالیاں دیتا رہا۔ پھر میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھا۔ ''یار، تم نے اس کی آواز بھی نہیں پہچانی؟''

اس نے جھلا کر کہا۔ ''چاچا! میں نے پہلے کبھی اس کی آواز سنی ہوتی تو پہچانتا۔'' پھر ہم میں سے کوئی نہ بولا۔

جب دوسرے دن کالج میں ہر ایک نے بار بار اس سے رات کے حادثہ کے متعلق پوچھنا شروع کیا تو اس نے تنگ آ کر نوٹس بورڈ پر ایک نوٹس لگا دیا کہ پچھلی رات کسی شخص نے مجھے چاقو سے گھائل کیا۔ میں مقابلہ کے لیے تیار نہ تھا اس لیے گہرے زخم آئے۔ پٹی اسی وقت کر الی گئی۔ اب روبصحت ہوں۔ براہ کرم کوئی صاحب میری روداد نہ پوچھیں۔ میں اپنی داستان سنا سنا کر تھک گیا ہوں۔'' اور اس کے نیچے اس نے موٹے حروف میں زمان خان بقلم خود لکھ دیا۔

اسی شام میں اسے سائیکل پر بیٹھا کر پٹی کروانے ہسپتال لے جا رہا تھا کہ راستہ میں سیما مل گئی۔ اس نے ہمیں روک لیا اور زمان سے کہنے لگی۔ ''مسٹر زمان، میں نے آج آپ کو پٹی باندھے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن اس کے متعلق پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ کالج سے گھر لوٹتے ہوئے آپ کا اعلان پڑھا تو میرا جی بھی آپ کو تھکا دینے کو چاہا۔۔۔۔ بتایئے کیا ہوا تھا؟''

زمان نے سائیکل کی گدی پر ٹیک لگا کر کہا۔ ''کوئی گیارہ بجے کے وقت جب میں اپنے کالج کے پچھواڑے آموں والی سڑک پر جا رہا تھا تو کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں رک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ متوسط قد کا ایک آدمی کمبل پہنے میرے پاس آیا۔ ذرا سی دیر کو رکا اور پھر ایک دم خنجر سے مجھ پر وار کیا جو میرے بائیں کندھے میں لگا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کو ہٹ کیا۔ مگر چونکہ میرا کندھا زخمی ہو گیا تھا۔ اس لیے ضرب ٹھیک سے نہیں لگی۔ اس نے مجھے نیچے گرا لیا اور پوچھا۔ ''تم سیما سے محبت کرتے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''ہاں''

سیما نے تنک کر پوچھا۔ ''آپ نے یہ کیوں کہا۔''

''وہ اس لیے۔'' زمان نے گھنٹی پر انگلی بجاتے ہوئے کہا۔ ''کہ اگر میں نہیں کہہ دیتا تو وہ مجھے چھوڑ دیتا اور سمجھتا کہ میں نے صرف جان بچانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ پھر اس نے خنجر اوپر اٹھا کر کہا۔ ''اس کا خیال چھوڑ دو۔ نہیں تو تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔ میں نے جواب دیا کہ جان سے جائے بغیر اس کا خیال کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ کہتے ہی میں نے پوری طاقت سے اُسے پرے دھکیلا اور وہ دُور جا گرا۔ سامنے کے چوبارے کی بتی جلی اور وہ بھاگ گیا۔

سیما اس کا جواب دیے بغیر تیز تیز آنکھوں سے اسے گھورتی آگے چلی گئی۔

راستے میں میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے یہ بات مجھے کیوں نہ بتائی۔'' تو اس نے جواب دیا کہ چونکہ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے۔

اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ بعد مارچ کے مہینے میں جب ہم لوگ اپنے کمروں کے دروازے کھلے چھوڑ کر اندر ہی سوتے تھے ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔ آدھی رات کو کسی نے ہمارے کمرے کے دروازے سے لگ کر سوئے ہوئے زمان پر پستول سے دو فائر کیے۔ ٹیبل لیمپ کا شیڈ ٹوٹ گیا اور میز پر پڑی ہوئی آکسفورڈ ڈکشنری کے بہت سے اوراق گولی چاٹ کر نکل گئی۔

چند دن بعد زمان ہوسٹل سے چلا گیا۔ پھر اس نے کالج آنا بند کر دیا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر پتہ نہیں کہاں چلا گیا آج پورے بارہ سال بعد اسی زمان نے کافی ہاؤس کی سیڑھیوں کے نیچے میری آنکھیں ہاتھ سے ڈھانپ کر گویا پوچھا تھا۔ ''میں کون ہوں؟''

بنجارا ہوٹل میں میں دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ سات بج گئے مگر وہ نہ آیا میں اپنے کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ ہوٹل کے پھاٹک پر زمان ایک بیرے سے میرا پتہ پوچھ رہا تھا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔

گھنٹی بجا کر میں نے بیرے کو بلایا اور زمان سے پوچھا۔ ''چائے پیو گے؟''

''نہیں۔'' اس نے منہ پھاڑ کر جواب دیا۔

''آخر کیوں؟''

''بس نہیں۔''

جب اس نے۔ ''بس نہیں۔'' کہا تو میں نے بیرے سے کہا۔ ''جاؤ کوئی کام نہیں۔''

میں نے زمان کے قریب کرسی کھینچ کر اسے پھر وہی خبر سنائی کہ اس کے چلے جانے کے بعد سیما بھی کہیں روپوش ہو گئی اور آج تک اس کا کوئی کھوج نہ مل سکا۔

''لیکن وہ گئی کہاں، یار؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''اس کے ماں باپ نے تلاش بھی نہ کی؟''

''کی بھائی، بہت کی مگر اس کا پتہ ہی نہ چلا۔''

''کمال ہے۔'' اس نے اپنے کرتے کی جیب سے ایک بیڑی نکالی اور چوسنے لگا۔ پھر میری طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا۔ ''جس رات مجھ پر کسی نے گولی چلائی اس سے اگلے دن سیما مجھے لائبریری میں ملی۔ اس نے مجھے کہا کہ میں شام کو اسے آرام باغ

میں ملوں۔ میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے اتنا کہا کہ شام کو بتاؤں گی۔ شام کو ہم کرکٹ گراؤنڈ سے پرے درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھ گئے۔ سیما نے کہا۔ ''زمان! اگر میں تم سے ایک چیز مانگوں تو دو گے۔'' میرے منہ سے پتہ نہیں کیوں۔ ''ضرور'' نکل گیا۔ اس نے روہانسی ہو کر کہا۔ ''مجھے اپنی زندگی دیجیے۔'' میں نے بازو پھیلا کر جواب دیا۔ ''لے لو'' تو اس نے کہا۔ ''میں اسے لے جا کر جہاں چاہوں رکھوں؟'' جو چیز تمہاری ہے اس کے رکھ رکھاؤ میں دخل دینے والا میں کون!'' پھر اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ ہاتھ باندھ کر بولی۔ ''یہاں سے چلے جایئے۔ اپنے گاؤں یا کہیں اور۔ وہ لوگ آپ کو مار ڈالیں گے۔۔۔۔۔ آپ کو۔۔۔۔ آپ کو۔۔۔۔۔۔'' پھر وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ میں نے کہا۔ ''یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ میرے حملہ آور سمجھیں گے میں ڈر کر بھاگ گیا ہوں۔ میرے دوست کہیں گے میں بزدل تھا اور باکسنگ میں مجھ سے ہارے ہوئے میرے حریف کہیں گے وہ اب ہوتا تو۔۔۔۔۔۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا، سیما، خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے۔ تم مجھے اس بات پر مجبور نہ کرو۔'' اس نے کہا۔ ''تم نے وعدہ کیا تھا اور میں نے اس کی شہ پر اتنی سی چیز کی فرمائش کی ہے۔ اب تم اس چیز پر اپنے وعدے کو قربان کر رہے ہو، میں نے سنا تھا کہ تمہارے وعدے کبھی نہیں ٹوٹتے۔''۔۔۔۔۔۔ میں نے سیما سے وعدہ کر لیا تھا کہ اپنے گاؤں تو نہ جاؤں گا پر بمبئی چلا جاؤں گا۔ وہاں میری برادری کے چند افراد سودی روپے کا لین دین کرتے تھے اور میں تمہیں بتائے بغیر ان کے پاس پہنچ گیا۔ دن رات مجھے ایک ہی خیال کھائے جا رہا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ موت سی چیز سے ڈر کر بھاگ گیا۔ میں نے سیما کو ایک خط لکھا کہ بمبئی کی زندگی سے تنگ آ چکا ہوں اور واپس آنا چاہتا ہوں۔ اب مجھے اپنے وعدے کا ذرا بھی پاس نہیں۔ اگر زندگی میں ایک وعدہ ایفا نہ ہو سکا تو کون سی قیامت آ جائیگی۔ میں تمہارے خط کا ایک ہفتہ تک انتظار کروں گا اور اس کے بعد پھر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ چار دن گزر گئے۔ خط نہ آنا تھا نہ آیا۔ پانچویں دن سیما میرے پاس پہنچ گئی اس نے مجھے کالج کی کتنی ہی دل چسپ خبریں سنائیں۔ تمہارے متعلق بتایا کہ تم نے ایک نیولہ پال لیا ہے اور اسے چھپا کر کلاس میں لے آتے ہو۔ بابا جی کے بارے مین بتایا کہ میرا نام لے کر بار بار کہتے ہیں کہ وہ پاپی بہت یاد آتا ہے۔ پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ خدا جانے ہم کو بھی یاد کرتا ہے یا نہیں۔۔۔۔۔ پھر سیما نے کہا میں اس لیے آئی ہوں کہ تم اپنا وعدہ نبھا سکو۔ اب میں عمر بھر تمہارے ساتھ رہوں گی اور تمہیں اپنے قول پر قائم رکھوں گی۔

مجھے کسٹم میں ایک معمولی سی نوکری مل گئی اور بھنڈی بازار کی اسی کھولی میں ہماری شادی ہو گئی لیکن یار وہ بجھی بجھی سی رہتی اور جب میں دفتر میں ہوتا تو روتی بھی رہتی۔ شام کو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی ہوتیں اور وہ چہرے پر مصنوعی مسکراہٹیں پھیلا پھیلا کر مجھ سے باتیں کرتی۔ پھر ایک دن پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا کہ میرے پیچھے پڑ گئی کہ بمبئی چھوڑ کر کہیں اور دُور نکل چلو۔ یوں تو یار میں رات کو اس کے ساتھ تاش کھیل کر اس کے سارے روپے جیت لیا کرتا تھا اور کبھی واپس نہ کرتا تھا۔ پر مجھے اس کے دل کا بڑا خیال تھا۔ اینگلو ایرانین آئل کمپنی میں مستریوں کی جگہ خالی تھی میں نے عرضی دے دی۔ انتخاب ہوا اور ہم آبادان پہنچ گئے۔ اور یار اب آبادان کی باتیں سناؤں گا تو رات بیت جائے گی مگر کہانی ختم نہ ہو گی۔ وہاں باکسنگ اور ڈائی نیمکس نے بڑا کام دیا۔ مائیکل صاحب باکسنگ کا مقابلہ کراتے اور میری گیم ضرور دیکھتے۔ ایک سال کے اندر اندر میں ڈپٹی انجینئر ہو گیا۔ سیما کے بڑے ٹھاٹھ تھے اس نے ساری ہندوستانی اخباریں اور رسالے اپنے نام جاری کرا رکھے تھے۔ اپنے بنگلہ کے باغیچے میں بید کی کرسی ڈال کر دیر تک مطالعہ کرتی رہتی۔ مستری اور فٹروں کی بیویاں اور بچے اس کے گرد

گھیرا ڈالے اسے طرح طرح کی باتیں سنایا کرتے۔

اس دوران میں ہم نے شاید ہی کوئی فلم کو چھوڑا ہو۔ ہر روز سینما کا چکر ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھار ہم ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ لیکن ہر بار میں ہی اسے مناتا۔ وہ اپنے ابا اور امّی کو یاد کر کے بہت رویا کرتی تھی۔ مجھ سے یہ بات پتہ نہیں برداشت نہ ہوتی اور یہیں سے جھگڑا شروع ہو جاتا۔ آبادان کی زندگی میں صرف ایک بار اس نے مجھے منایا اور وہ بھی غیر ارادی طور پر تمہاری تصویر اخباروں میں چھپی تھی۔ وہ اس کی نظر بھی پڑی۔ میں اس وقت ایفائنری کے ایک ہزار فٹ اونچے کولنگ ٹنک پر بیٹھا سرکٹ دیکھ رہا تھا کہ سیما ٹرالی پر چڑھ کر اوپر میرے پاس پہنچ گئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ان دنوں میرے ساتھ روٹھی ہوئی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ وہ بنگلہ سے ریفائنری اور پھر فرش سے اتنی اونچی چوٹی پر چڑھ آئی تھی۔ اخبار میری طرف بڑھا کر اس نے تمہاری تصویر دکھائی اور کچھ نہ بولی۔ میں سرکٹ کا معائنہ مستریوں پر چھوڑ کر ٹرالی میں اس کے ساتھ سوار ہو گیا۔ ٹرالی آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ میں جنگلے کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا تو اس نے میری آستین پکڑ کر کھینچی میں کچھ بولا نہیں۔ پھر اس نے میری کلائی پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بولی۔ ''یہاں نہ بیٹھو۔'' میں نے کہا۔ ''تم جو مجھ سے بولنا ہی نہیں چاہتی ہو۔ یہاں سے کیوں اٹھاتی ہو؟'' اس نے میری دونوں کلائیاں پکڑ کر اپنی طرف کھینچیں اور میرے ساتھ چمٹ کر بولی۔ ''تم سے نہ بولوں گی اور کس کے ساتھ بولوں گی۔'' ٹرالی زمین پر پہنچ گئی اور سارے مستریوں اور مزدوروں سے بے خبر وہ مجھ سے اسی طرح چمٹی رہی۔

ہماری شادی کے پورے چھ سال بعد سہیل پیدا ہوا۔ اور سیما کا اس سے دل لگ گیا۔ اس کے بعد شاید ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اور یار میں تم سے کہا نہ کہ لڑکیاں بھی عجیب بادشاہ ہوتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔''

میں نے پوچھا۔ ''سیما اب کہاں ہے؟''

زمان نے جواب دیا۔ ''پچھلے سال دسمبر کی ایک شام سہیل اپنے کونونٹ سے ڈرامہ دیکھ کر آیا تو راستہ میں اسے بڑی سردی لگی۔ گھر آ کر اس نے اپنی ممی سے کہا۔ کہ مجھے گرم دودھ پلاؤ تو اس نے یہ سوچ کر کہ باورچی دیر لگائے گا خود ہی ایک پیالہ میں دودھ ڈال کر اسے اپنے ہیٹر پر رکھ کر پلگ جو لگایا تو اسے شدید برقی صدمہ پہنچا۔ رات گئے تک سارے ڈاکٹر اس کے گرد جمع رہے لیکن وہ جانبر نہ ہو سکی۔ سہیل کو اپنی ممی کی موت کا بہت صدمہ ہوا۔ وہ اسی دن سے بیمار ہے۔ سیما کی موت کے بعد مجھے اپنے معاہدے کے مطابق ایک سال وہیں رہنا پڑا اور اس عرصہ میں سہیل کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ سیما کے بعد میں اس پر پوری توجہ نہ دے سکا۔ اس دوران میں جی بھر کر برج کھیلی اور سیما کا جمع کیا ہوا روپیہ ہارتا رہا۔۔۔۔۔۔۔ اور اب مجھے یہاں آئے ہوئے پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا۔ سہیل کی حالت اب بالکل بگڑ چکی ہے۔ ڈاکٹر نے سٹرٹپو مائی سین کے ٹیکے تجویز کیے ہیں اور آج دوپہر میں اسی کا پرمٹ لینے جا رہا تھا۔ کہ تم مل گئے۔''

میں نے پوچھا۔ ''پرمٹ مل گیا؟''

''ہاں۔'' اس نے اپنے کرتے کی بغلی جیب میں ہاتھ ڈال کر خاکی رنگ کا ایک کاغذ نکال کر دیکھا اور بولا۔ ''اب تو دکانیں بند ہو گئی

ہوں گی۔صبح ٹیکے خریدوں گا۔''

میں نے کہا۔''الفنسٹن سٹریٹ میں ابھی بہت سی دوکانیں کھلی ہوں گی۔ابھی چل کر کیوں نہ لے لیں۔''

زمان نے کہا۔''اب کل ہی لوں گا۔''

''کل کیوں؟''میں نے پوچھا۔

''بس یار آج نہیں لوں گا۔''

''نہیں کیوں؟''

''نہیں لوں گا،یار، کیوں کیا؟''

''پیسے نہیں؟''میں نے پوچھا۔

''ہیں۔''اس نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

''دکھاؤ۔''

''نہیں دکھاتا۔''

میں نے کہا۔''اچھا تمھاری مرضی۔یہ کوئی نئی بات نہیں۔اتم ہمیشہ سے ایسے ہی ضدّی اور ہٹ کے پکے رہے ہو۔بچے کی جان کے لالے پڑے ہیں اور تم اپنی وضعداری نبھا رہے ہو۔''

اس نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور بولا۔''اچھا اب چلتا ہوں۔کل تم سے ملوں گا دس گیارہ بجے کے قریب۔''

وہ چلا گیا تو میں نے اپنے بٹوے سے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور پڑیا بنا کر مٹھی میں چھپا لیا۔پھر میں تیزی سے اس کے پیچھے گیا وہ ہوٹل کے پھاٹک کے پاس ایک دیا سلائی خرید رہا تھا۔

میں نے کہا۔''ظالم،اتنی لمبی رات درمیان میں ہے۔گلے تو مل لو۔''جب وہ مجھ سے بغل گیر ہوا تو میں نے سو روپے کا نوٹ چپکے سے اس کی بغلی جیب میں ڈال دیا۔تھوڑی دُور اس کے ساتھ چل کر میں واپس اپنے ہوٹل میں آ گیا اور بیرے سے کہا کہ اگر کوئی صاحب مجھ سے ملنے آئیں تو انہیں کہہ دینا کہ میں یہ ہوٹل چھوڑ کر چلا گیا ہوں۔۔۔۔۔۔اور دیکھو صبح سات بجے ایک وکٹوریہ لا کر مجھے جگا دینا۔میں صبح کی گاڑی سے واپس جا رہا ہوں۔

یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں آیا۔زمان کے نام ایک خط لکھا،اور اسے میز پر ڈال کر سو گیا۔

صبح سات بجے بیرے نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔میں نے کہا۔''جاگ گیا ہوں بھئی،تم جاؤ۔''

مگر بیرے نے شاید میری آواز نہیں سنی۔اسی طرح دروازہ پیٹے گیا۔جھلا کر میں بستر سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔سامنے زمان کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔اس نے ہنس کر کہا۔''یار عجب گھوڑے بیچ کر سوتے ہو۔اس عمر میں ایسی نیند اچھی نہیں ہوتی۔بھلے مانس صبح اٹھ کر اللہ کا نام لیا کرو۔''

میں نے خفت مٹاتے ہوئے کہا۔ ''بھائی رات کو دیر تک جاگتا رہا۔ اسی لیے آج دیر سے اٹھا ہوں۔ ورنہ اب تو میں کالج کا وہ لونڈا نہیں رہا۔'' پھر میں نے اس کے ہاتھ سے بیڑی لے کر یونہی ایک دو کش لگائے اور پوچھا۔ ''سہیل کیسا ہے؟''

اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یار، وہ بھی اپنی ممی سے جا ملا۔'' پھر اس نے اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دامن الٹ کر کہا۔

''یار، ذرا دیکھنا۔ کل رات یہاں سے جاتے ہوئے کسی صاحب زادے نے ہماری جیب کاٹ لی۔ جیسے ہم جیبوں میں نوٹ ہی ڈالے پھرتے ہیں۔ سالے کو سٹر ٹپو مائی سین کے پرمٹ اور تین آنے کے سوا اور کیا ملا ہوگا۔''

کٹی ہوئی جیب سے اس کی زرد زرد انگلیاں چھپکلیوں کے سروں کی طرح باہر جھانک رہی تھیں۔

بندرابن کی کنج گلی میں

میں آپ کو افسانہ پھر کبھی سناؤں گا۔ آج مجھے ایک راز افشا کرنے دیجیے۔ ایسا راز جو پتہ نہیں کب سے میرے سینے میں کھٹک رہا ہے اور مجھے بے چین کیے دیتا ہے۔ شاید اس میں آپ کو اپنی دلچسپی کا کوئی سامان نظر نہ آئے لیکن میں کیا کروں، مجھے بھی تو دل سے ایک کھٹک نکال کر آرام سے زندگی بسر کرنے کی ضرورت ہے۔

جب میں نے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا تو چاچا نے کہا۔ ''کمیٹی میں نوکری کر لو۔ ساری برادری میں شان ہو جائے گی۔'' مگر میں نہ مانا اور اُسے بتائے بغیر کالج میں داخل ہو گیا۔ نمبر اچھے تھے۔ شکل و شباہت سے میں خاصا غریب دکھائی دیتا تھا۔ قمیص اور جوتوں کے پیوندوں نے میری سفارش کی اور میری فیس معاف ہو گئی۔ کتابوں کا خرچ چلانے کے لیے میں نے چاچا کے ساتھ دریا کمانا شروع کر دیا اور مجھے دن بھر کی کمائی میں سے دو آنے بلاناغہ ملنے لگے۔ جس دن ہمارے اکھنڈے میں دو تین رو ہو بھی آ جاتے اس دن چاچا مجھے بنا مانگے چار آنے دے دیتا۔ پہلے پہل چاچا کی طرح ماں بھی میری پڑھائی کے خلاف تھی مگر جب اسے پتہ چلا کہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مجھے ڈگری کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت بنگلہ اور پیاری سی کار بھی مل جائے گی تو اس نے میری مخالفت چھوڑ دی اور میری لالٹین کی چمنی کو ہر روز اپنی اوڑھنی سے صاف کرنے لگی۔

مچھلیاں پکڑنے کے لیے میں رات گئے تک چاچا کا ساتھ نہ سے سکتا کیوں کہ گھر آ کر مجھے پڑھنا ہوتا تھا۔ تین چار مرتبہ ٹاپا دریا میں پھینک کر جو کچھ بھی ہاتھ آتا میں اُسے ٹوکری میں ڈال کر اپنی راہ لیتا۔ بابا فرید کنارے پر حقّہ کی آگ بنا رہا ہوتا۔ مجھے چلنے کی تیاری میں مصروف پا کر بڑی محبت سے کہتا۔ ''نمدار یا! دو کش کھینچتا جا، تلونڈی کا تمبا کو ہے۔ سورگ کے جھونٹے آئیں گے، بچّو، سورگ کے۔'' لیکن میں ٹاپا کندھے پر ڈال کر کہتا۔ ''بابا دیر ہو رہی ہے۔'' اور پھر تیزی سے قدم بڑھاتا راستہ ناپنے لگتا۔ پل کے نیچے چاچا اور اس کے ساتھی چریلا پانی میں ڈالے اندھا شکار کھیل رہے ہوتے اوپر کنارے پر بابا کے حقّے کے پھول دہک رہے ہوتے۔

ٹاپے کی لڑیوں سے سینے کی گولیاں باندھے ہوئے ماں یہ ضرور کہتی۔ ''تیرا چاچا تیرے سے چھوٹا ہو گا جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ ہر روز اکیلا دریا کمانے جاتا تھا پر کیا مجال جو کبھی گونی ٹوٹنے دی ہو۔ تو پڑھا گنا ہے۔ پھر بھی جال کو اجڑا ہوا آلنا بنا لاتا ہے۔''

میں لکھتے لکھتے جواب دیتا۔ ''بول نہ ماں۔ میں پڑھ رہا ہوں۔''

اور ماں خاموش ہو جاتی۔

چونکہ کالج میں ہر کوئی جانتا تھا کہ میں سجاول مچھیرے کا لڑکا نمدارا ہوں اسی لیے مجھے اپنی غریبی چھپانے کی چنداں ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ میرا ہر ہم سبق بڑی خندہ پیشانی سے مجھے اپنی کتابیں پڑھنے کو دے دیا کرتا۔ دوپہر کا کھانا اکثر اوقات میں اپنے ان دوستوں کے ساتھ ڈائننگ روم میں کھایا کرتا جو ہوسٹل میں رہتے تھے۔ اِن میں سے چند اتنے اچھے تھے کہ مجھ سے کھانے کی ''قیمت'' بھی لے لیا کرتے تھے مگر وہ کچھ اتنی زیادہ نہ ہوتی تھی۔ مجھے ان کے لیے ایک آدھ مضمون یا منطق کے دو چار سوالوں کا جواب لکھنا ہوتا تھا جو فوراً ہی لکھے جاتے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی بھی اپنے دوستوں سے ہٹیا نہ سمجھا۔ پر ایک تمنا ایسی تھی جو کم بخت پھلنے پھولنے ہی نہ ا

آتی تھیاور وہ تھی شرارتوں میں شرکت کی آرزو۔ ہوسٹل اور کالج میں تمام اجتماعی اور انفرادی شرارتیں میرے بنائے ہوئے پلان کے مطابق ہوتی تھیں۔لیکن میں ان میں شرکت نہ کرسکتا تھا۔ ہر شرارت کے خاتمہ پر جرمانے ہوا کرتے اور مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں ایک آدھ جرمانہ بھی برداشت کرسکوں۔

ہفتہ کی ایک شام جب میں نے ہوسٹل کے منچلے جوانوں کو رائے دی کہ آج آدھی رات کو پچھواڑے جو مالٹوں کا باغ ہے اس پر چھاپہ مارو اور ایک مالٹا بھی شاخ پر نہ چھوڑو تو تجویز تو کثرتِ رائے سے پاس ہوگئی لیکن سب نے مجھے بھی اس شب خون میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ میں نے حسب عادت وہی عذر پیش کیا تو نثار نے ادیہ کہہ کر بے معنی قرار دے دیا کہ وہ میری جگہ بڑے سے بڑا جرمانہ ادا کرنے کو تیار ہے۔اس پر میں نے بھی ہامی بھر لی۔

میں کہنے کو تو ہاں کہہ آیا مگر راستہ بھر یہی سوچتا رہا کہ اگر کالج سے نکالے جانے کا جرمانہ ہوا تو؟ اس رات ایک بھی مچھلی نہ پھنسی حالانکہ پانی پر تیرتے ہوئے تر ونڈے بار بار غوطہ مار کر اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ بہت سی مچھلیاں آس پاس گھوم رہی ہیں۔ جال ایک طرف پھینک کر میں بابا فرید کے پاس جا بیٹھا اور حقّہ کے کش لینے لگا۔اتنی دیر تک بابا پتہ نہیں کیسی کیسی باتیں کرتا رہا مگر ایک کا جواب بھی ٹھیک سے نہیں دیا۔ میں برابر مالٹوں کے باغ پر چھاپے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔آخر یہ فیصلہ کر کے اٹھا کہ چھاپہ مارا جائے۔

''لیکن چھاپہ مارا کس وقت جائے؟'' نثار نے پوچھا۔

''ایک بجے۔'' میں نے بیڑی سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

ایک بج گیا اور ہم ایک ایک کر کے غسل خانہ کے پائپ کے ذریعے ہوسٹل سے باہر نکل گئے۔ چاند نکلا ہوا تھا۔روشنی تقریباً دن جیسی تھی مگر اس میں گرمی کی جگہ خنکی اور سختی کی جگہ نرمی تھی۔ میں نے ساری پارٹی کو باغ کی کچی دیوار کی اوٹ میں چھپنے کو کہا اور خود ایک انداز سے دیوار پھاند کر باغ میں اتر گیا۔ چاروں گوشوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں نے ایک مالٹا توڑ کر چکھنا بھی چاہا کہ سامنے سے ایک نسوانی آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

''میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں کون؟'' اس نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''میں جو ہوتا ہے۔''

''اچھا۔'' وہ اور آگے بڑھی اور بولی۔ ''یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

''مالٹے توڑنے۔''

''بازار سے لے کر کیوں نہیں کھاتے۔ تمھارے باپ کا باغ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''بازار میں تو ٹوٹے ٹکائے ملتے ہیں اور یہاں۔۔۔۔۔''

اس نے زمین سے مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلا اُٹھا لیا اور سینہ تان کر بولی۔ ''لو توڑ و مالٹے۔''

میں نے اس کے جواب میں جیب سے ایک بیڑی نکالی اور اسے دیا سلائی دکھا کر کہا۔ ''اچھا نہیں توڑتے۔'' اس جب میں واپس مڑا تو اس نے ڈھیلا زمین پر پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد باغ میں غل مچا۔ سیٹیاں گونجیں۔ کتّے بھونکے اور سارے پودے دس منٹ کے اندر اندر ہو کر شاخوں کے سر اُوپر اُٹھا کر چاندنی اور اس کے ماں باپ کی گالیاں اور کوستے سنائی دیتے رہے۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

ساٹھ پینسٹھ لڑکوں میں سے ایک آدھ کو تو چغلی کھانی ہی تھی۔ نذیر نے مجھے اس فتنہ کا سرغنہ قرار دے کر پرنسپل کو رات کے ڈاکے کا سارا حال بتا دیا۔ میری پیشی ہوئی اور میں صاف مکر گیا بلکہ میں یہ بات ماننے سے بھی انکار کر دیا کہ پچھلی رات میں ہوسٹل میں تھا۔ پرنسپل نے ہوسٹل کے تمام لڑکوں کو اکھٹا کر کے مجھ سے کہا کہ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ کل رات تم یہاں تھے تو تمھیں کالج سے نکال دیا جائے گا۔ ایک دفعہ جھوٹ بول لیا تھا۔ اب سچائی کی سرحدیں بہت دُور معلوم ہوتی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے سچائی افق کے پاس رہتی ہے اور میں جوں جوں اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کروں گا وہ دُور ہوتی جائے گی۔ اس لیے ایک مرتبہ پھر جھوٹ بولنا پڑا۔

دوسرے دن پہلے ہی پیریڈ میں چپڑاسی پرنسپل صاحب کا بلاوا لے کر آ گیا۔ دفتر کے سامنے ساری پارٹی جمع تھی۔ اندر باغ کا مالی اور اس کی لڑکی اونچے اونچے بول رہے تھے۔ ایک ایک کو اندر بلایا جاتا اور اسکی شناخت کروائی جاتی۔ میری باری آئی اور میں اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر لڑکی کی آنکھیں خوشی سے ناچ اُٹھیں۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ہاتھ باندھ کر کہا۔ ''مجھ پر رحم کرو۔ میں بھی تمھاری ہی طرح ایک نادار آدمی ہوں اور اگر تم نے مجھے پہچان لیا تو میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔

لڑکی کے باپ نے پوچھا۔ ''یہی ہے وہ لڑکا؟'' تو لڑکی نے ایک آنکھ میچ کر اور پیشانی پر بہت سی شکنیں ڈال کر کہا۔ ''یہ تو نہیں۔ وہ پٹکی جو گا تو لمبا پتلا سینک سلائی سا تھا۔''

میرے حلق میں ایک چھوٹی خاردار جھاڑی اُگ پڑی۔ میں نے تشکر آمیز نظروں سے اُسے دیکھا اور اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے بڑی بڑی آنکھیں کھولیں اور جیسے کہنے لگی۔ ''اس مرتبہ تو ہم نے تمھیں معاف کر دیا لیکن اگر پھر ایسی حرکت کرو گے تو یاد رکھنا۔''

ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد مجھے وظیفہ مل گیا اور بی۔ اے کرنے کے لیے لاہور آنا پڑا۔ کالج کی فیس وغیرہ ادا کر کے کل چھ روپے بچتے۔ پانچ روپے مہینہ چاچا بھیج دیتا تھا۔ خرچ تو خیر کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا تھا لیکن سوٹ سلوانے اور سینما دیکھنے کو پیسے نہ بچتے تھے اور اب یہاں وہ دوست بھی نہ تھے جو میری اعانت کرتے۔ چونکہ یہاں کسی کو میرا اصلی نام معلوم نہ تھا اور میں نمدار صاحب کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اس لیے اور بھی مصیبت تھی۔ گردوپیش نے مجھے اپنی مفلسی چھپانے اور بڑا بننے پر مجبور کر دیا تو میں نے دونوں باتوں کو اپنا لیا۔

شاہ عالمی کے باہر بانس کے ایک سوداگر میمن سیٹھ تھے۔ انہوں نے اردو خط و کتابت کے لیے مجھے پانچ روپیہ مہینہ پر نوکر رکھ لیا۔ شام کو ایک مرتبہ جانا ہوتا تھا اور چند خطوں کے جواب لکھنے پڑتے۔ پہلی تنخواہ پر گیارہ آنے کی ایک رنگ برنگی ٹائی خریدی۔ ایک پرانا امریکن کوٹ لے کر اسے اپنے جسم پر فٹ کروایا اور تنخواہ ختم ہو گئی۔ تھوڑے دنوں بعد کالج میں ایک مباحثہ ہوا اور مجھے دس روپیہ نقد انعام

ملا۔ اگلے مہینہ کی تنخواہ چار دن پہلے لے کر ایک پتلون بھی سلوائی۔ معزز آدمی تو بن گیا۔ لیکن یہ خدشہ جان کا لاگو ہو گیا کہ کسی دن چاچا سبز کنارے والی سفید دھوتی اور بغیر تسموں کے سیاہ بوٹ پہن کر کالج نہ آ جائے۔

آنرز کی کلاس تھی۔ پروفیسر ابھی آیا نہ تھا اور ہم مستطیل میز کے ارد گرد بیٹھے گپیں مار رہے تھے کہ کانتا نے پوچھا۔ ''پھولوں میں سے اچھا پھول کون سا؟''

''گوبھی کا۔'' میں نے ایک دم جواب دیا۔

سریندر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''بھئی ایسا غیر شاعرانہ جواب ادب کی کلاس میں!''

کانتا نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے سب سے اچھی خوشبو والا پھول کونسا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''رومن چپل پر ادن کا پھول۔''

کلثوم نے کاپی سے نگاہ اُٹھا کر بڑی متانت سے مجھے دیکھا اور پھر اپنی کاپی پر جھک گئی۔ اس کی آنکھوں میں صبحِ بنارس کی سی نرمی تھی اور اس کے بال برسات کی اندھیری رات کی طرح سیاہ تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں کو بے پروائی سے میز پر ڈالے پڑھ رہی تھی۔ انگلیاں بہت زیادہ لمبی نہ تھیں۔ جلد بہت زیادہ سفید نہ تھی۔ مگر میز پر رکھے ہوئے وہ ہاتھ حضرت مسیح کی عبا کی دو موٹی موٹی سلوٹیں معلوم ہوتے تھے۔ کلثوم اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ اچھی لگی تھی مگر اب کی بار وہ نہ صرف اچھی ہی لگی تھی بلکہ اپنے سے بھی برتر بھی۔ میرا جی چاہا کہ ابنِ مریم کے دامن کو ایک بوسہ دے کر آنکھوں سے لگا لوں مگر کلاس روم میں اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

میری عادت تھی کہ تقریباً ہر پیریڈ میں کلاس سے باہر جا کر آدھا سگریٹ یا سالم بیڑی پیتا اور پھر دانتوں پر رومال رگڑ کر اپنی جگہ آ بیٹھتا۔ ایسے ہی ایک دن میں برآمدے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا کہ کلثوم میرے پاس آ کر بولی۔ ''آپ اتنے سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''اس لیے کہ میرے پاس اتنے سگریٹ ہوتے ہیں اور اس لیے کہ فالتو سگریٹ بنک میں جمع نہیں کرائے جا سکتے۔''

وہ ذرا مسکرائی اور کہنے لگی۔ ''سگریٹ نوشی سے تو پھیپھڑے کالے ہو جاتے ہیں اور۔۔۔۔''

میں نے کہا ''ہوتے ہیں تو ہونے دو۔ انھیں کون دیکھنے جائے گا۔ شکر ہے کہ۔۔۔۔۔''

اس نے کہا۔ ''انگلیاں بھی تو کالی ہو جاتی ہیں۔''

''انگلیاں؟'' میں ہاتھ اُٹھا کر اپنی انگلیاں دیکھیں۔ ''کالی تو خیر نہیں پیلی ضرور ہو جاتی ہیں۔''

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور لاپروائی سے لائبریری کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

وہ کسی امیر آدمی کی بیٹی تھی۔ عنابی رنگ کی بڑی کار میں آتی۔ شوفر اس کی کتابیں اُٹھا کر کمرے تک پہنچانے آتا اور پلٹتے ہوئے ضرور سلام کرتا۔ اسے اپنے باپ کی دولت پر کچھ ایسا غرور نہ تھا۔ موٹر سے نکلتی تو کندھے سکوڑے ہوئے یوں گھٹی گھٹی چلتی جیسے کسی نے اس کے سر پر احسان کا پہاڑ دھر دیا ہو۔ سفید رنگ کی شلوار قمیص پہنے اور سر پر جارجٹ کا سبز دوپٹہ اوڑھے وہ اسی طرح آتی جاتی رہی کالج کی گیلریوں میں وہ اسی طرح کھوئی کھوئی چلتی جیسے وہ بھول کر یہاں آ گئی ہو دراصل اسے کہیں اور جانا ہو۔

اب میں نے اس کے سامنے سگریٹ پینے چھوڑ دیے تھے۔ جونہی وہ سامنے سے آتی دکھائی دیتی ہیں سگریٹ کو جلدی سے بجھا کر جیب میں ڈال لیتا اور دانتوں سے ناخن کاٹنے لگتا۔ وہ میرے قریب سے گذرتی اور مجھے دیکھ کر آگے بڑھ جاتی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر مجھے یوں لگتا جیسے اُونچے اُونچے گھنے درختوں کے جھنڈ میں صاف وشفاف پانی کے تال کے نیچے طلسماتی چراغ جل رہے ہوں۔ شاید انہی دیئوں کے آگے میرا سگریٹ روشن نہ رہ سکتا تھا!

ایک دن پتہ نہیں کیا ہوا کہ وہ نہ آئی اور میری حالت اس پن ڈبے جیسی ہوگئی جو دن بھر غوطے مارنے کے بعد بھی کوئی مچھلی نہ پکڑ سکے اور شام کو خالی ٹوکری لے کر اپنے ڈیرے چلا جائے۔ دوسرے دن اس نے بتایا کہ وہ اپنی ایک عزیز کی شادی میں اس درجہ مصروف رہی کہ کالج نہ آسکی۔ میں نے کہا۔ ''اگر نہیں آنا تھا تو کم از کم مجھے ہی بتا دیا ہوتا تا کہ میں بھی نہ آتا۔''

اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''میں تو کل بھی نہ آسکوں گی۔''

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور دوسرے دن کالج نہ گیا۔ اس سے اگلے دن مجھے پتہ چلا کہ وہ کل کالج آئی تھی۔ مگر ایک پیریڈ پڑھ کر چلی گئی۔

خاموشی کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت میں ڈر کا عنصر بھی تھا۔ پتہ بھی کھڑکتا تو کانپ اُٹھتی۔ ہوا کے جھونکے سے فرش پر کاغذ کا پرزہ سرسراتا تو وہ دبک جاتی اور اگر کمرے کا دروازہ کھٹ سے بند ہوتا تو وہ اپنی نشت پر اچھل پڑتی۔ خوف سے اس کے چہرے پر کئی رنگ آتے اور کروٹیں بدل بدل پھیل جاتے۔ اس کی وہی آنکھیں سپنوں کی طرح کجلا جاتیں اور اس کی سانس ذرا تیز ہو جاتی۔ میں نے اس سے کیہ مرتبہ اس بارے میں پوچھا بھی مگر وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکی۔ بس یہی کہتی رہی کہ میں شروع ہی سے ڈرپوک ہیں۔

گھنٹی بج جاتی اور کوئی پروفیسر دیر تک نہ آتا تو کلثوم کہتی۔ ''پروفیسر صاحب ابھی تک نہیں آئے۔''

تو میں فوراً کہہ اُٹھتا۔ ''وہ تو فوت ہو گئے۔''

سب ہنس پڑتے اور اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو جاتا۔

اس نے مجھے کئی مرتبہ ٹوکا تھا کہ یہ لفظ استعمال نہ کیا کروں مگر مجھے تو یہ لفظ کہنے اور اس کے ٹوکنے میں مزہ آتا تھا۔ سریندر کبھی غیر حاضر نہ ہوا تھا مگر ایک دفعہ نہ جانے کیا ہوا کہ اکھٹے پندرہ دن تک کالج نہ آیا اور جس دن وہ آیا تو میں نے اس کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ''ہم تو سمجھتے تھے کہ جناب فوت ہو گئے مگر آپ تو چلے آرہے ہیں'' تو کلثوم نے کہا۔ ''یہ بڑی زیادتی ہے۔ آپ سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ یوں نہ کہا کریں۔ آپ کو ڈر نہیں لگتا ایسی باتیں کرتے؟''

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ''نہیں۔''

ایک دن اس کی کار اسے لینے نہ آئی اور وہ دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ میں نے کہا۔ ''آج تانگے میں چلی چلو۔ آخر غریب تانگے والے بھی تو آپ ایسے دھن بانوں سے آس لگائے گھوڑے جوتے پھرتے ہیں۔'' اس نے میری بات مان لی اور ہم آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے چلنے لگے۔ راستہ میں اس نے ایک دو مرتبہ مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ آج اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک

تھی۔ وہی چمک جو صدیوں زمین کا پسینہ چاٹ چاٹ کر کوئلے میں پیدا ہو جاتی ہے۔

آخری مرتبہ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''مجھ سے رہا نہیں جاتا۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ برا مان جائیں گے۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

میں نے کہا۔ ''اگر برا ماننے کی بات ہوئی تو البتہ مان جاوں گا۔''

''میں نہیں کہتی۔'' اس نے سر ہلا کر کہا۔

میں نے کہا۔ ''اچھا نہیں مانوں گا۔''

اس نے کہنا شروع کیا۔ ''میں چھوٹی سی تھی تو ہمارے قصبے میں بیساکھی کے میلہ پر ایک دفعہ سرکس بھی آیا۔ سرکس والے رات کو اپنے کرتب دکھاتے اور دن کو ایک چھوٹے سے خیمے میں اپنے جانوروں کے پنجرے جمع کر کے چڑیا گھر بنا لیتے جنھیں دیکھنے کا ٹکٹ ایک آنہ ہوتا تھا۔ ابا جان مجھے بھی اس کی سیر کے لیے لے گئے۔ اس میں شیر تھے، بندر تھے، بڑے بڑے اژدہے اور چھوٹے چھوٹے نیولے تھے۔ ایک پنجرے میں پلوں جتنی منی منی گائیں تھیں۔ اور ان کے اردگرد کو مڑیاں، بھیڑیے، لگڑ بگڑ اور گیدڑوں کے پنجرے بھی تھے۔ داخلے کے دروازے کے پاس ہی ایک بڑے سے بلے کا پنجرہ تھا۔ مٹیالے رنگ کا دھاری دار باگڑ بلا! اور سارے جانور یا تو زور زور سے چیختے رہتے یا اپنے پنجوں سے پنجروں کے دروازے کھڑکاتے رہتے مگر وہ بلا پیال کے بستر پر آرام سے پڑا سویا کرتا۔ مجھے یاد ہے اس کے ناک کی پھنک ہلکے گلابی رنگ کی تھی اور ہمیشہ تم آلود رہا کرتی۔ کبھی کبھار وہ انگڑائی لے کر اٹھتا سارے بدن کو تانتا اور پھر اپنی پوستین جھٹک کر کونے میں پڑا ہوا گوشت کھانے لگتا۔ اس کے بعد اپنے پنجرے میں چکر کاٹنے لگتا۔ اس کی شکل و شباہت بڑی متین اور سنجیدہ قسم کی تھی۔ چکر کاٹتے ہوئے اس کے جسم کی دھاریاں ایک دوسری پر پلٹتی رہتی تھیں اور اس کی دم بڑی سستی سے اس کے جسم کا ساتھ دیتی۔ چڑیا گھر ہمارے بنگلے سے کچھ ایسا دُور نہ تھا۔ میں امّی جان کی تلے دانی سے چپکے سے ایک آنہ نکالتی اور وہاں پہنچ جاتی۔ کسی دوسرے جانور کی طرف توجہ دیے بغیر میں اس کے پنجرے کے سامنے جا کھڑی ہوتی اور دیر تک اسے دیکھتی رہتی۔ میرا جی چاہتا کہ ایک پتلی سی سینک لے کر اس کی ناک چھوؤں تا کہ اسے ایک پیاری سی چھینک آ جائے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ مجھے وہ اچھا بھی لگتا تھا اور اس سے خوف بھی آتا تھا اور۔۔۔۔۔۔ اور اتنے برسوں کے بعد بھی پھر جیسے اپنے بچپن میں پہنچ گئی ہوں۔ آپ مجھے وہی باگڑ بلے دکھائی دیتے ہیں۔ اچھے سے!'' وہ میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ایک لمحہ کے لیے اپنے چہرے پر غصہ کے بناوٹی آثار پیدا کر کے مصنوعی چھینک لی اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

میں نے کہا۔ ''تم اپنی گفتگو میں پنجابی کے بہت سے الفاظ بولتی ہو کیا تمہیں۔۔۔۔۔۔۔''

اس نے سر ذرا اونچا اُٹھا کر کہا۔ ''مجھے اس زبان سے محبت ہے اور اسی کی بدولت میں اپنی ایک نہایت عزیز سہیلی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہوں۔۔۔۔۔ کونونٹ میں ہمیں انگریزی کے سوا کسی اور زبان میں بات کرنے کی اجازت نہ تھی لیکن میرا جی اپنی سہیلیوں کو اڑیے کہنے کو

ترستا تھا۔ راحت نے مجھے اس بات کی اجازت دے رکھی تھی کہ میں اس علیحدگی میں ''اڑیے راحت'' کہہ کر پکار سکوں۔ ایک مرتبہ کامن روم میں کیرم کھیلتے ہوئے راحت نے اپنی گوٹ ہاتھ سے پاکٹ میں ڈال لی۔ میں نے دیکھ لیا اور بگڑ کر کہا۔ ''جا اڑیے، ہم تیرے ساتھ نہیں کھیلتے۔ تو تو بے ایمانی کرتی ہے۔''

اس پر ساری لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور راحت مجھ سے ناراض ہو گئی۔''

میں نے کہا۔ ''تم مجھے اڑیا کہہ لیا کرو۔''

وہ یہ سن کر گھبرا سی گئی اور پھر اسی طرح گردن جھکا کر چلنے لگی۔

جب کلثوم دو ہفتے کی چھٹی ختم کر کے کراچی سے واپس آئی تو اس نے آتے ہی پوچھا۔ ''میں جو اتنے دن کالج نہیں آئی تو آپ نے کیا کہا۔''

''کچھ بھی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کچھ تو کہا ہوگا؟''

''ہاں۔'' میں نے ذرا سوچ کر کہا۔ ''جب پروفیسر نے پوچھا تھا کہ کلثوم نہیں آئیں تو میں نے ہولے سے کہا تھا۔ وہ تو فوت ہو گئیں۔''

کلثوم نے کہا۔ ''اور اگر میں سچ مُچ مر جاتی تو آپ کو افسوس ہوتا نا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تو ایک محاورہ ہے اور تم محاورے کو لغوی معنی پہناتی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں۔''

اس نے نہ جانے کیوں برا مان کر کہا۔ ''آپ کے لیے تو میں کبھی کی مر چکی ہوں۔''

میں گھبرا گیا۔ میرے نزدیک فوت ہو جانا ایک اور بات ہے اور مر جانا کچھ اور۔ اس نے ان دونوں کو گڈمڈ کر دیا تھا۔ حالانکہ دونوں میں بڑا فرق تھا۔

کراچی کی سیر کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''ایک دن ہم ہاکس بے گئے تھے۔ اس کے قریب ہی لنبا ڑا ماہی گیروں کی ایک بستی ہے۔ مچھیرے بڑے بڑے جال پانی میں ڈال کر اُونچے اُونچے گیت گاتے ہیں۔ ان کی عورتیں اپنی جھونپڑیوں کے آگے بیٹھ کر جالوں کی مرمت کیا کرتی ہیں۔ موتیوں ایسے دانتوں والی سیاہ فام خوبصورت لنبا ڑنیں۔ میں نے ان کے بہت سے فوٹو اتارے۔ انھوں نے مجھے ناریل کے پتوں کی ٹوکریوں میں تازہ مچھلیاں تحفہ کے طور پر دیں۔ ان میں بہت سی میری سہیلیاں بن گئیں مگر ہمارا ان کا ساتھ! ان میں خلوص ہے، مروت ہے اور ہم! ہم! اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''لیکن آپ میں ایک طرح کا خلوص ہے، مروت کی باس ہے۔ وہی مروت جو صرف ان کے یہاں مل سکتی ہے۔''

میں سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ آپ میں بھی مچھلی کو باس ہے۔ ویسی ہی باس جو لنبا ڑنوں سے آیا کرتی ہے۔ دل کے چور نے کہا۔ اسے پتہ لگ گیا ہے کہ تم سجاول مچھیرے کے لڑکے نمدار اہو۔ میرے گلے میں مچھلی کا کانٹا اٹک گیا اور

میں نگاہیں زمین پر گاڑ کر اپنے جوتے کو آہستہ آہستہ فرش کر گھسنے لگا تا کہ اس کی بہت سی باتیں سمجھ میں نہ آسکیں۔

کلثوم کہہ رہی تھی۔ ''میرا کوئی ساتھی نہیں۔ ہمارے خاندان میں بہت سے آدمی ہیں مگر سارے کے سارے تاجر ہیں۔ ان کے یہاں ہر قسم کا سودا ہے لیکن لطیف جذبات کی کمی ہے۔ کوئی ایسا ذہن نہیں جو میرا ساتھ دے سکے۔ کسی میں اتنی سکت نہیں کہ میرے ساتھ مل کر میری سکیم چلا سکے۔ لیکن میں کیا! میں تو خود ان کے ساتھ اسی دھارے میں بڑی تیزی سے بہے جاتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے میرا مستقبل کیا ہوگا۔ مجھے اس دن کا علم ہے جب میری تعلیم کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ میں تو اس دن کا انتظار کر رہی ہوں۔ شوق ست۔ ہاں بڑے شدت سے۔''

اسی طرح کے بے شمار فقرات دہراتی وہ وہاں سے چل دی۔ نہ میں نے ان باتوں کا کوئی جواب دیا نہ اس نے پلٹ کر پوچھا۔

جب سے وہ کراچی سے آئی تھی کچھ الجھی الجھی سی رہتی تھی۔ عجیب عجیب سوال پوچھتی تھی۔ کیسی کیسی سکیمیں بناتی تھی۔ اپنے تمام رشتہ داروں حتیٰ کہ امّی اور ابا کے متعلق بھی پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہہ جاتی۔ ادھوری ادھوری باتیں۔ ٹوٹے پھوٹے جملے اور مدھم مدھم سرگوشیاں!

میں اس سے ملتے ہوئے اب اس لیے کتراتا تھا کہ اس پر میری حیقت کھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہاکس بے مچھیروں کی تعریفوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میری خفت ٹال رہی ہے۔ ورنہ اسے کیا پڑی تھی ہر روز انہی کی باتیں کیا کرتی۔

ایک رات میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح جا کر اس سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں سجاول ماہی گیر کا بیٹا ہوں اور میرا نام نمدارا ہے۔ میں خود بھی ٹاپا پھینک پھینک کر مچھلیاں پکڑتا رہا ہوں اور مجھے پھنگا مچھلی سب سے لذیذ لگتی ہے۔ لیکن یہ فیصلہ میں نے اس وقت کیا تھا۔ جب میں مائی کے تنور سے ایک آنہ کی دال روٹی کھا کر اپنی پھٹی ہوئی بنیائن اور نیکر پہنے مونج کی چارپائی پر چت لیٹا تھا۔ مگر صبح جب مجھے اپنی ہستی کا اعتراف کرنا تھا تو میری کوڑیالی ٹائی نے اپنا پھن اُٹھا کر کہا۔ ''اوں ہوں۔''

ادبی کتابوں سے منہ موڑ کر کلثوم اقتصادیات اور معاشیات کی اوندھی سیدھی کتابیں پڑھنے لگی۔ سارا دن لائبریری کی ایک ہی الماری سے چمٹی رہتی اور کاغذ کے پرزوں پر لمبی لمبی عبارتیں لکھ کر انھیں اپنے تھیلے میں ڈالتی رہتی۔ وہ ادب کی شاہراہ پر چلتے چلتے افادی الاقتصادی بن گئی اور اس نے شیکسپیئر، ہارڈی اور کیٹس کو ایک دم بھلا دیا۔ یونیورسٹی لائبریری میں انگریزی ادب کی الماریوں کے پاس سے گذرتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ کہا۔ ''آپ کو پتہ ہے انفرادی جذبات کی ترجمانی کرنے والا سارا ادب۔۔۔۔۔۔''

''فوت ہو جائے گا۔'' میں بات کاٹ کر کہا۔

''ہاں۔'' وہ ہنس پڑی۔ اس کی نگاہیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔ یہ نہایت ہی موزوں لفظ ہے۔

افادی اپنے خیالات میں دن بدن کڑ ہوتی چلی گئی اور وہ ادب سے کافی دُور ہو گئی۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے اشارتاً کہا بھی کہ وہ امتحان نہ دے سکے گی کیوں نکہ بہت سی ان ہونی باتوں کا جواب دینے کو جی نہیں چاہتا۔ مجھے اس کے اس رویہ سے سخت شکایت تھی۔ دل چاہتا تھا کہ کسی دن چپکے سے لائبریری جا کر اس الماری کی کتابوں کے درمیان فاسفورس کا ایک قتلہ رکھ آوں لیکن پھر خیال آتا کہ اُسے رنج ہوگا۔''

یونیورسٹی لائبریری سے ایک دن اچانک مجھے ایک انگریز مصنف کے خطوط کی کتاب مل گئی۔ ہیں کھڑے کھڑے ایک دو خط پڑھے۔ یہ کتاب لائبریری میں ۱۹۲۷ء سے پڑی تھی۔ مگر ایک بار بھی اشوع نہ ہوئی تھی۔ میں وہ کتاب لے کر آ گیا اور رات گئے تک پڑھتا رہا۔ بڑے جذباتی خطوط تھے۔ سیدھی سادی زبان میں پیاری پیاری باتیں لکھی تھیں۔ پہلا خط کچھ اس طرح شروع ہوتا تھا:

جانِ تمنا!

جاننا چاہتی ہو کہ تمھارے چلے جانے کے بعد مجھ پر کیا بیتی۔ مجھ سے پوچھتی ہو کہ پہاڑ کے دامن میں کسانوں کے ننھے ننھے جھونپڑے مجھے اب بھی ویسے ہی حسین نظر آتے ہیں اور وادی میں گلاب اور یاسمین کی نکہت اب ویسی ہی طرب انگیز ہے۔ جب تم یہاں تھیں؟ ۔۔۔۔افسوس! ہر چیز نے اپنا لطف اور انداز بدل دیا ہے۔ جب سے تم نے اس وادی کو چھوڑا ہے میں صاحبِ فراش ہوں۔ آج یونہی میں کھانے کی میز پر بیٹھا میرا دل اندر ہی اندر ڈوب گیا۔ تنہا کابی، ایک چھری، ایک کانٹا اور پانی کا گلاس۔ میں نے دکھے دل سے اس کی طرف دیکھا جس پر تم بیٹھا کرتی تھیں۔ اُسے خالی دیکھ کر میرا جی بھر آیا اور میں نے چھری اور کانٹا میز پر ڈال دیے اور اسی رومال سے منہ ڈھانپ لیا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مجھ سے پوچھتی ہو کہ مجھے وادی کی بہاریں اب کیسی لگتی ہیں۔۔۔۔۔۔

دوسرے دن پروفیسر کے آنے سے ذرا پہلے میں نے وہ کتاب کھول کر افادی کے سامنے رکھ دی۔ اس نے ورق اُلٹ کر مصنف کا نام دیکھا اور پڑھنے لگی۔ لیکن پروفیسر آ گیا اور اُسے وہ کتاب بند کر دینا پڑی۔ لکچر کے دوران میں اُس نے کئی مرتبہ کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور کتاب کی جلد پر انگلی سے کچھ لکھتی رہی۔ پروفیسر کوئی باریک نکتہ بیان کرنے لگا۔ ہم سب اس کی طرف متوجہ ہوئے اور افادی نے بھی گردن ذرا سی ٹیڑھی کر کے پروفیسر کو دیکھنا شروع کیا۔ بے خیالی میں اس نے کتاب کی جلد کو کھولا اور اس کے کھڑے کنارے پر اپنی ٹھوڑی رکھ دی۔ پھر اس کی ٹھوڑی ذرا پھسلی اور اس کے کنارے پر اس کے لب پہنچ گئے۔ ایک دو مرتبہ اس کے لب آہستہ آہستہ ہلے اور پھر اس کے سفید سفید دانت اس کے کنارے پر ٹک گئے اور دیر تک ٹکے رہے۔ مجھے ایسے لگا جیسے یسوع اپنے مہمانوں کے پاؤں دھو کر انھیں بوسہ دے رہا ہے۔

جاتے ہوئے وہ کتاب اپنے ساتھ لے گئی اور دوسرے دن جب وہ کتاب میرے پاس پہنچی تو اس پر جا بجا نشان لگے ہوئے تھے۔ اور اس کی جلد پر ایک کونے پر ارغوانی رنگ کا ایک چھوٹا سا بوسہ چمٹا ہوا تھا۔ افادی نے اس کتاب کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہا اور نہ میں نے پوچھا۔

اگلے دن میں نے لائبریرین کو بتایا کہ وہ کتاب گم ہو گئی ہے اور مجھ سے اس کی قیمت لے لی جائے۔ دیر تک پُرانے پُرانے رجسٹر دیکھنے کے بعد اس نے کہا یوں تو اس کتاب کی قیمت دو روپے ہے۔ لیکن نایاب ہونے کی وجہ سے ہم چودہ روپے چارج کریں گے۔ یکمشت چودہ روپے میں نے زندگی میں چند مرتبہ ہی دیکھے تھے۔ میں نے گڑگڑا کر مزید رعایت کے کیے کہا لیکن وہ اسی قیمت پر اڑا رہا۔ ہاں ایک رعایت اس نے یہ ضرور دی کہ میں وہی کتاب بازار سے لے کر لائبریری میں داخل کرا دوں۔ چودہ روپے محال تھے اور کتاب

دستیاب ہونی ناممکن تھی۔ میں نے اپنے سیٹھ سے روپے مانگے تو اس نے ضمانت طلب کی۔ جس کے پاس میں ڈیڑھ سال سے کام کر رہا تھا آج وہی مجھ سے ضمانت طلب کر رہا تھا۔ تین چار دنوں کے بعد میں نے وہ کتاب لائبریرین کو واپس کر دی کہ کتابوں کے انبار تلے آ گئی تھی۔

جس طرح رادھا بندا بن کے گلی کوچوں میں سے ہوتی ہوئی کنج گلی پہنچ کر شام کے دوارے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اسی طرح میں لائبریری کی بڑی بڑی الماریوں کے پاس سے گذرتا ہوا سیدھا اس الماری کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور وہی کتاب نکال کر دیر تک ارغوانی رنگ کے اس منے سے پھول کو دیکھ کر واپس آ جاتا۔

امتحان قریب آ گئے تھے اور میرے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے کلثوم کی یاد وابستہ ہو۔ دیوانِ غالبؔ پر میں نے اپنا نام نہ لکھا تھا سوچا اس پر اس کے آٹو گراف لے لوں گا اور شاعری اور افادیت جو ایک جگہ اکٹھا کر لوں گا۔ لیکن وہ نہ مانی اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ۔ ''میں کوئی لیڈر نہیں، ادیب نہیں، مشہور ہستی نہیں۔ آٹو گراف کس لیے دوں۔'' اس پر میں اس سے ناراض ہو گیا اور اس سے بولنا بند کر دیا۔ اس نے کئی مرتبہ مجھے بلانے کی کوشش کی مگر میں بولا نہیں۔ ایک دن اس نے راستہ روک کر کہا۔ ''امتحان کے بعد روٹھ جانا۔ ابھی تو دو مہینے پڑے ہیں۔ اس کے بعد ساری زندگی روٹھے ہوئے ہی گذرے گی۔''

میں نے منی تھتھا کر جواب دیا۔ ''میں امتحان سے پہلے ہی اپنے درمیان خلیجیں ڈال لینی چاہتا ہوں۔ مجھے۔۔۔۔۔۔''

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ '' خلیجیں بہت گہری ہوتی ہیں اور وہ پاٹی نہیں جا سکتیں اور جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے یہ وسیع ہوتی جاتی ہیں۔''

میں نے بڑی شان سے جواب دیا۔ ''ہوا کریں۔ انھیں پاٹتا ہی کون ہے۔''

امتحان قریب آتا جا رہا تھا اور وہ پڑھائی سے لاپرواہ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ کئی کئی دن تک کالج نہ آتی اور جب آتی تو ایک آدھ پیریڈ بعد واپس چلی جاتی۔ سریندر نے ایک بار اس سے امتحان دینے کی ارادے کی بابت پوچھا تو اس نے مغلیہ شاہزادیوں کی طرح گردن اُونچی کر کے کہا۔ ''ہم ضرور امتحان میں بیٹھیں گے!'' لیکن شاید اس کا ارادہ نہیں تھا۔

مسلسل ایک ہفتہ غائب رہنے کے بعد وہ اپنے نیلے رنگ کے تھیلے کو ہاتھ میں جھلاتی ہوئی کالج گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ سرس کے درخت تلے شکستہ بنچ پر بیٹھے ہوئے میں نے ایک مرتبہ اُسے دیکھا اور پھر کتاب پڑھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور زمین پر پڑے ہوئے ادھ جلے سگریٹ کو دیکھنے لگی۔ جو میں نے اُسے ادھر آتے دیکھ کر پھینک دیا تھا۔ اپنا تھیلا کھول کر کلثوم نے اس میں جھانکا اور بولی۔ ''ہونہہ نہیں بولتے تو نہ سہی!'' اور اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر گولڈ فلیک کا ایک ڈبہ نکال کر بنچ پر رکھ دیا اور پھر جدھر سے آئی تھی ادھر ہی چل دی۔ میں نے ایک نظر ڈبے کو دیکھا اور پھر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں لٹکتا ہوا تھیلا آگے پیچھے جھول جھول کر کہہ رہا تھا۔ ''پھیپھڑے کالے ہوتے ہیں۔ انگلیاں کالی ہوتی ہیں۔''

اس کے بعد نہ وہ کالج آئی نہ اس نے امتحان دیا اور نہ کہیں، ملی۔

بی۔اے آنرز کی فرسٹ کلاس ڈگری تو مل گئی پر نوکری کہیں نہ ملی۔ وظیفے کے چھ روپے ختم ہو گئے اور لاہور میں گذارن کرنی مصیبت بن گئی۔ ہر روز پانچ چھ عرضیاں ہاتھ سے لکھ کر یا ٹائپ کروا کر دستی یا بذریعہ ڈاک مختلف دفتروں میں پہنچا دیتا مگر یہ وہ دن تھے جب سال میں دو تین آسامیاں نکلتیں اور یونیورسٹی سے چار پانچ سو گریجویٹ۔ گولڈ فلیک کا وہ ڈبہ جو اتنا عرصہ سنبھال سنبھال کر رکھا تھا آخر ایک دن کٹا اور سگرٹیں ختم ہو گئیں۔ چاچا نے پھر خط لکھا کہ کمیٹی میں نوکری کر لوں۔

سیٹھ نے کہا۔ دس روپیہ مہینہ لے لو اور دن بھر کام کرو۔ لیکن میں کم از کم تحصیلدار ہونا چاہتا تھا یا ایسی نوکری کی تلاش تھی جہاں ایک علیٰحدہ کمرہ میں میرا دفتر ہو اور میرے گھنٹی بجاتے ہی جھپاک سے ایک چپڑاسی چق اُٹھا کر اندر داخل ہوا کرے لیکن ایسا نہ ہوا۔ ایک دو دفتروں میں جگہیں خالی بھی تھیں۔ لیکن وہاں گھنٹیاں سن کر مجھے چق اُٹھا کر اندر جانا تھا۔ میں نے ویسی نوکری سے انکار کر دیا۔

جب تحصیلداری، نائب تحصیلداری، ضعلداری، آبکاری اور خودکشی کے تمام دروازے بند ہو گئے تو میں بغیر کسی کو اطلاع دیے سندھ چلا گیا اور تال پوروں کی نوکری کر لی۔ ان کی زمینوں کی آمدنی کا جمع خرچ کر کے ہر روز بڑے سائیں کو ایک پرچہ بھیجنا پڑتا۔ اس کے صلہ میں مجھے دس روپے ماہوار ملتے اور دو وقت کا کھانا۔ تالپور دینا بھر کی سب سے شریف قوم ہے۔ وہ شکار کھیلنے جاتے تو گاؤں کے کمینوں اور اپنے مزارعین کو ضرور ساتھ لے جاتے۔ جب وہ شکار مار کر لاتے جب بھی یہ لوگ ساتھ ہوتے اور جب شکار بھونا جاتا تو بھی اور جب وہ کھانے لگتے اس وقت بھی ہم ان کے گرد کھڑے ہوتے۔

بڑے سائیں اکثر کہا کرتے۔ ''منشی جی! سارا دن یونہی بیٹھے لکھتے رہتے ہو۔ کھیتوں پر جا کر مزارعوں کے ساتھ ہل ہی چلایا کرو۔''

میں ان کی بات سن کر مسکراتا اور یونہی بیٹھے لکھنا چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ کئی مرتبہ جی میں آئی کہ چاچا کو لکھ دوں کہ میں کہاں ہوں۔ لیکن پھر خیال آتا کہ ماں کو میری موت سے زیادہ مجھے بنگلہ اور کار نہ ملنے کا دکھ ہوگا۔ کسی اندھیری رات کو جب دھڑلے کی بارش ہوتی اور بجلی بار بار چمکتی تو مجھے خیال آتا کہ اس دانت دکھاتی ڈائن ایسی رات میں چاچا بھنور جال پھیر پھیر کر مچھلیاں تلاش کر رہا ہوگا اور ماں کولکی میں بیٹھی ہم دونوں کو یاد کر رہی ہوگی۔ کونے میں کشتی چلانے کے ڈانڈے رکھے ہوں گے اور چولھے کے پاس ککڑ کا حقہ پڑا ہوگا جس کی چلم چولھے کی راکھ میں اوندھی پڑی ہوگی۔ ماں ہر روز میری لالٹین صاف کر کے جلاتی ہوگی اور اس کے پاس ٹاپا لے کر بیٹھ جاتی ہوگی۔ جس میں وہ سیسہ کی گولیوں کی بجائے اپنے آنسو پروتی ہوگی۔ ایسی بارشوں نے مجھے بے چین کر دیا۔ دریائے سندھ کے کنارے کی یہ دیہاتی زندگی مجھے شدت سے اپنا وطن یاد دلانے لگی اور میں نے تال پوروں کی نوکری چھوڑ دی۔

حیدر آباد کے اس اسپتال میں مجھے نرس بوائے ہوئے آج آٹھ سال ہوئے ہیں۔ نرسیں قینچیاں، نشتر، سوئی، دھاگے، زخم، دوائیاں، مریض اور آہنی چارپائیاں میری زندگی کا جزو بن چکی تھیں پر پتہ نہیں اس وقت میرا جی کیوں اس نوکری سے بھی بیزار ہو گیا۔ کل رات سیاہ رنگ کی ایک خوبصورت سی کار وارڈ کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ مریض کو سٹریچر پر ڈال کر پلنگ پر لٹایا گیا۔ سیٹھ گھبرایا ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو بڑی بڑی رقموں کا لالچ دے کر مریض کو بچا لینے کی التجا کر رہا تھا۔ میں پرے کونے میں ہیٹر جلا کر سرنج اوبال رہا تھا۔ میرے ساتھی نے قریب سے گذرتے ہوئے کہا۔ ''ایک اور مصیبت۔''

اپنے ایپرن کی ڈوریاں کستے ہوئے میں ڈاکٹر صاحب کو بلانے چلا۔ نئے مریض کے قریب سے گذرتے ہوئے میں نے اس مصیبت پر نگاہ ڈالی۔ وہاں کلثوم پڑی تھی۔ اسکی آنکھیں بند تھیں اور بال کھلے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ ویسا ہی تھا۔ ہونٹوں کی سرخی قائم تھی اور وہ بڑے اطمینان سے سو رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے سیٹھ کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ بچ جائیں گا۔ بچ جائیں گا۔ یہ کوئی جاستی خطرناک بیماری نئیں۔ دورہ پڑا ہے۔ ٹھیک ہو جائیں گا۔۔۔''

''تو میں جاؤں؟'' سیٹھ نے پوچھا۔

''جاؤ! جاؤ۔'' ڈاکٹر نے آستین چڑھا کر کہا۔ ''کب واپس آئیں گا؟''

''کل دوپہر کو'' سیٹھ نے سوچ کر کہا۔ ''کراچی کسٹم کا تار آیا ہے۔ ادھر ہمارے امپورٹ مال کو جھگڑا ہے۔ میں جاتے ہی کھلاس کرالوں گا۔''

''سیٹھ چلا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے اندر آ کر ٹیکا دیا اور مجھے مریض کے ہوش میں آنے کی رپورٹ کے لیے کہہ گئے۔

بارہ! ایک! دو۔۔۔ ڈھائی بجے میں اسٹول سے اُٹھا اور اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ آہستہ سے کلثوم کا کندھا ہلا کر میں نے کہا۔'' افادی!'' مگر وہ بولی نہیں۔ دوسری مرتبہ میں نے ذرا زور سے پکارا۔ ''افادی''

ہونٹوں کو ذرا سی جنبش ہوئی اور آنکھیں تھوڑی سی کھلیں۔ میں نے خوش ہو کر اُسے پھر بلایا اور وہ آنکھیں کھول کر خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اب ان آنکھوں میں صبح بنارس کی سی نرمی نہ تھی۔ وہ کچھ دھندلا سی گئی تھیں۔ میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر ایک مرتبہ پھر پکارا۔ آنکھوں کو پھر جنبش ہوئی اور دریا کے کناروں پر چھائی ہوئی اس دھند کے پیچھے مجھے وہی باغ والی لڑکی نظر آئی جو ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔ ''دیکھا ہم نے تمہیں پھر معاف کر دیا!''

کلثوم سب کے لیے مر گئی تو میرے لیے بھی ختم ہو گئی۔ میں یہ کہہ کر اپنے آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہتا کہ وہ زندہ ہے یا وہ ازل سے میرے پاس تھی اور ابد تک رہے گی۔ وہ واقعی مر گئی ہے۔ لیکن اس کا علم کسی کو نہیں کہ افادی بھی ختم ہو گئی ہے۔ ہر شخص کو پتہ ہے کہ یونیورسٹی لائبریری کی کتابوں میں نیم کے سوکھے اور خستہ پتے ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ ایک کتاب کے ساتھ ایک سوکھا ہوا ارغوانی پھول بھی چمٹا ہوا ہے۔

بابا

جب سورج کی پہلی کرن ٹین چھت والی کے سوراخ سے اندر داخل ہوئی اور اس نے ایلن اور وحید کو سوتے ہوئے پایا تو وہ چپ چاپ ویسے ہی باہر لوٹ گئی۔ کیوں کہ آسمان پر مٹیالے بادل تیرتے پھرتے تھے اور ان کا گرج گرج کر برس جانے کو جی چاہتا تھا۔ جب سورج کی وہی کرن دوبارہ اندر آئی تو ایلن کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سر اٹھا کر وحید کو دیکھا جو ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا اور جس کی آنکھیں خوابیدہ بچوں کی طرح ذرا ذرا کھلی تھیں۔ گالوں پر خط کا سرمئی غبار سیاہی مائل ہو گیا تھا اور بالوں کی چمک دار نمود غیر ہموار تھی۔ ایلن نے اپنی مرمریں ناک گلابی پھننگ کو پیار سے وحید کے گالوں کے اس ریگ مار پر پھیرا اور دو کنکنے ہونٹ اس کے ماتھے پر رکھ کر اس کو ہلانے لگی۔ درِ فتنہ باز ہوا۔ وحید نے ایلن کے گریبان سے باہر لٹکی ہوئی طلائی صلیب کو دیکھا اور اسے اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ سورج کی پہلی کرن دبے پاؤں پھر باہر نکل گئی۔

بابا مسعود کو لے کر رہٹ پر گیا تھا۔ کچھ دنوں سے وہ اسے کلمہ سکھا رہا تھا۔ اُٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے، بابا مسعود سے لا الٰہ الاّ اللہ سنا کرتا اور جب وہ ایک مرتبہ بالکل ٹھیک سنا دیتا تو وہ اسے میٹھی گولیاں اور بسکٹ دیتا۔ اب بھی دُور رہٹ کی گدی پر بابا مسعود کو گود میں لیے کمالو کو کلمہ سنوا رہا تھا۔ سامنے بیری کے نیچے لیگ ہارن اور ریڈ روڈ زمین کرید کرید کر دانے چگ رہی تھیں۔ اور ''چتلی'' کھپریل تلے اپنے نومولود بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔ کمالو نے دیوار پر سے بالٹی اُٹھا کر کہا۔ ''چاچا جب تک تم یہاں ہو میں چتلی دوہ لوں۔ ذرا دیر ہو گئی تو ڈکرانے لگے گی۔ پھر تم وحید بھائی کے غصہ سے تو واقف ہی ہو۔''

''دوہ لے۔'' چاچا نے اطمینان سے کہا اور مسعود کے جیب میں پھونک مار کر بولا۔ ''دیکھوں، یہاں کیا بھر رکھا ہے۔''

مسعود نے تھوڑی سی مزاحمت کی تو بابا نے اپنی جیب سے گولی نکال کر کہا۔ ''اچھا نہ دکھا۔۔۔۔ ہم گولی نہیں دیں گے۔''

گولی دیکھ کر مسعود نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور لپ سٹک کا خول باہر نکال کر مٹھی کھول دی۔ بابا نے خول اس کے ہاتھ سے لے کر برسیم کے سبز مخملی کھیت میں پھینک دیا اور مسعود کی پیٹھ پر دھپا مار کر بولا۔ ''بیٹا اسے جیب میں نہیں رکھا کرتے۔ یہ زہر ہے۔ زہر ہے۔ اس پاس رکھو تو آدمی مر جاتا ہے۔''

''لیکن ممی تو اسے۔۔۔۔۔''

''تو ممی کی بات چھوڑ۔'' بابا نے ناک سکوڑ کر کہا۔ ''وہ عورت ہے تو مرد۔ مسعود احمد۔۔۔۔ چوہدری مسعود احمد۔ اور یہ زہر صرف مردوں پر ہی اثر کرتا ہے۔''

مسعود اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اس نے ہونٹ لٹکا کر کہا۔ ''اچھا اگر میرا کارتوس پھینکا ہے تو مجھے میٹھی گولی تو دو بابا۔۔۔۔ پر میں تین گولیاں لُوں گا۔ میرا کارتوس اتنے سو روپے کا تھا۔'' اس نے ہاتھ پھیلا کر روپے بڑھائے اور بابا نے اپنی جیب میں ساری گولیاں نکال کر اسے دے دیں۔